سرمد صہبائی کے دو غیر مطبوعہ اُردو اسٹیج ڈرامے

(''اشرف المخلوقات'' اور ''حیش'')

محمد نوید

Sarmad Sahbai is well known as a modern Urdu poet, screenplay writer, film writer, director and modern Urdu stage playwright. He established a strong tradition of original modern Urdu drama, innovative techniques of stage, the use of music, on the stage. He granted a unique and exclusive style to modern Urdu playwrights by symbols and metaphors through the use of lights and set.

In this research article I have presented technical and intellectual study of his two unpublished plays "Ashraf -al- Makhluqaat", and "Hysh".According to those the common man is fighting to stay alive with having distress of current political situation of Pakistan, religious environment and ethical culture, they show how are capitalists external forces swallowing a man's thoughts and feelings.

سرمد صہبائی شاعر، ٹی وی ڈرامہ نگار، فلم نگار، ہدایت کار اور جدید اُردو اسٹیج ڈرامہ نگار کے طور پر اپنی مسلم حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے طبع زاد جدید اردو اسٹیج ڈرامے کی ایک پختہ روایت قائم کی، اسٹیج کی جدید تکنیک، سٹیج پر موسیقی کا استعمال، روشنیوں اور سیٹ کے استعمال میں، منفرد اسلوب میں علامتوں اور استعاروں سے جدید اُردو اسٹیج ڈرامے کو ایک منفرد اور اچھوتا اسلوب بخشا۔اس مقالے میں ان کے دو غیر مطبوعہ ڈراموں ''اشرف المخلوقات'' اور ''حیش'' کا فنی و فکر اور تکنیک کے اعتبار سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں سیاسی صورت حال، مذہبی ماحول اور تہذیب و اخلاق کے زوال میں عام آدمی کس طرح اپنے کرب کو سینے میں لیے ہوئے زندہ رہنے کی جنگ لڑ رہا ہے۔سرمائی اور بیرونی قوتیں کس طرح عام آدمی کے خیالات، جذبات اور احساسات کو نگل رہی ہیں۔

سرمد صہبائی کا تعلق جدید اُردو لکھنے ڈرامہ نگاروں میں سرفہرست ہے۔انھوں نے اُردو اور پنجابی ڈرامے کی

روایت سے اسلوب، تکنیک اور موضوعات کی سطح پر بغاوت کی ہے اور جدید اُردو سٹیج ڈرامے کی صورت میں ایک بلند معیار قائم کیا اور اسے ایک نیا موڑ دیا ہے۔ سرمد صہبائی ایک باشعور ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے ہاں جہاں اپنی انفرادی سوچ کا عمل ملتا ہے وہاں ادب کا اپنا منفرد اسلوب بھی ہے۔ شاعری تو ان کو وراثت میں ملی لیکن ان کا اصل میدان ڈرامہ ہے۔ سرمد صہبائی نے جدید اُردو سٹیج ڈرامے کو بہت سی نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے ہاں ایک مسلسل تجسس اور نئی چیز کی تلاش وجستجو ملتی ہے۔ انھوں نے نت نئے تجربے کیے ہیں، وہ شاعری ہو یا ڈرامہ کوئی نہ کوئی نئی چیز قارئین اور ناظرین کو دی ہے۔ ان کے ڈراموں میں علامتوں اور استعاروں کا ایک الگ جہان ملتا ہے۔ کہیں بھی ابلاغ میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ ان کا یہ طرز نگارش جہاں قاری کو نئی انسانی نفسیات اور مزاج کی نئی تہوں سے روشناس کراتا ہے وہاں قاری اور مصنف کے درمیان ایک مضبوط رابطے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

سرمد صہبائی کا پورا نام خواجہ سلیم پال ہے۔ وہ سرمد صہبائی کے قلمی نام سے جانے جاتے ہیں۔ سرمد صہبائی ۱۹ نومبر ۱۹۴۵ کو سیالکوٹ میں ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ کے پرائمری سکول گورمان اور رام تالائی سے حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا خاندان سمن آباد لاہور منتقل ہوگیا۔ یہاں جونیئر ماڈل سکول سمن آباد سے پانچویں کرنے کے بعد سنٹرل ماڈل ہائی سکول لوئر مال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے اور پھر یہاں سے ۱۹۶۷ء میں ایم اے انگریزی کیا۔ سکول کے زمانے سے ان کی شاعری مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگی پھر گورنمنٹ کالج لاہور ڈرامیٹک کلب میں اداکاری اور ڈرامہ نگاری کے جوہر بھی سامنے آئے۔ ان کی تصنیفات، ریڈیو ڈرامے، فلم، ٹی وی ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے حسب ذیل ہیں:

شاعری:

۱۔ **تیسرے پہر کی دستک** (طویل نظم)، لاہور: دارالاشاعت، ۱۹۷۰ء
۲۔ **ان کہی باتوں کی تھکن** (نظمیں اور غزلیں)، لاہور: دارالاشاعت، مارچ ۱۹۷۶ء
۳۔ **نیلی کے سورنگ** (کافیاں)، کراچی: کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمیٹیڈ، فروری ۱۹۸۶ء
۴۔ **پل بھر کا بہشت**، (نظمیں اور غزلیں)، اسلام آباد: الحمرا، جون ۲۰۰۸ء
۵۔ **ماہ عریاں**، لاہور: شراکت پرنٹنگ پریس، دسمبر ۲۰۱۴

ریڈیو ڈرامے:

۱۔ ''ایک دن اور''، ریڈیو پاکستان لاہور، ۱۹۷۰ء
۲۔ ''موم کے پر'' ریڈیو پاکستان لاہور، ۱۹۷۲ء

ٹی وی ڈرامے/فلم:

۱۔ ''لیمپ پوسٹ''، پی ٹی وی لاہور ۱۹۶۸ء
۲۔ ''بچوں کا پارک'' پی ٹی وی اسلام آباد، ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء

۳۔ ''فن کار گلی'' (ٹیلی فلم)، این ٹی ایم ٹی وی، فروری ۱۹۹۳ء
۴۔ ''کلاسک ٹو'' پی ٹی وی اسلام آباد، فروری ۱۹۹۰ء
۵۔ ''نیا قانون'' (ماخوذ ڈرامہ) پی ٹی وی اسلام آباد، ۱۹۹۵ء
۶۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' (ماخوذ ڈرامہ)، جیو ٹی وی، ۲۰۰۵ء
۷۔ ''جلوس'' جیو ٹی وی، ۲۰۰۶ء
۸۔ ''سوگندھی'' (ماخوذ ڈرامہ) جیو ٹی وی، ۲۰۰۷ء
۹۔ ''جل پری''، جیو ٹی وی، ۲۰۱۱ء
۱۰۔ ''مورمحل'' جیو ٹی وی، مئی ۲۰۱۶ء
۱۱۔ ''ماہ میر'' (فلم) جولائی ۲۰۱۶ء

اسٹیج ڈرامے:

۱۔ ''تو کون؟'' (پنجابی اسٹیج ڈرامہ)، لاہور: مجلس شاہ حسین، ۱۳ فروری ۱۹۷۱ء
۲۔ ''حیش''، نجم الدین ڈرامہ فیسٹول، پاکستان آرٹس کونسل لاہور، ۱۹۷۱ء
۳۔ ''کٹھ پتلیوں کا شہر'' (اُردو اسٹیج ڈرامے)، لاہور: فوکس پریس لمیٹیڈ، دسمبر ۱۹۷۳ء
۴۔ ''شعر لاشعر''، پاکستان آرٹس کونسل لاہور، ۱۶ دسمبر ۱۹۷۵ء
۵۔ ''اشرف المخلوقات''، الحمرا آرٹس کونسل لاہور، ۲۵ جون ۱۹۷۶ء
۶۔ ''پنجواں چراغ''، اجوکا تھیٹر لاہور، ۱۹۷۸ء
۷۔ ''ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ'' ۲۳ نومبر ۱۹۸۶ء
۸۔ ''طوطا راما''، لیاقت ہال راولپنڈی، ۱۹۸۶ء

یہاں میرے پیش نظر سرمد صہبائی کے ڈراموں کے دو قلمی مسودے ہیں۔ پہلا مسودہ ''اشرف المخلوقات'' کا ہے۔ یہ مسودہ سرمد صہبائی کے ہاتھ سے لکھے بڑے سائز کے ۷۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کھیل کے صفحہ اوّل پر ''۲۵ جون ۱۹۷۶ء'' درج ہے لیکن الحمرا لاہور آرٹس کونسل کے دفتری ریکارڈ میں اس کھیل کو پیش کرنے کی تاریخ ''۱۶۔اگست ۱۹۷۶ء'' درج ہے۔

دو ایکٹ پر مشتمل یہ ایک بلیک فارس ہے۔ اس کھیل میں اردو سٹیج ڈرامے کے روایتی اسلوب اور پلاٹ کی بجائے علاقائی اور تجریدی تجربوں پر مبنی کردار اور مکالمے ہیں۔ اس میں ڈرامہ نگار نے معاشرتی ٹوٹ پھوٹ، سماجی بندھنوں میں جکڑے جھوٹ اور منافقت کے رشتوں اور انسانی المیوں کو بیان کیا ہے۔ جبر و قدر، خیر و شر اور معاشرتی تضادات سے کرداروں کے اندر داخلی تصادم کو پیش کرتے ہوئے کرداروں کی ذہنی کشمکش کے بعد ان کا ٹریٹ منٹ بھی کیا ہے۔ اس کھیل میں فلش بیک، خود کلامی اور خواب کی تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں وقت تسلسل کے ساتھ پیش نہیں ہوا بلکہ نائم نان لینئر (nonlinear time) ہے۔ ڈرامہ نگار نے ہر ایکٹ کو مختلف سین میں تقسیم

کیا ہے اس لیے وہ ''سین فیڈ اِن''، ''سین فیڈ آؤٹ'' لکھتے ہیں۔اس کھیل کا عنوان ''اشرف المخلوقات'' کھیل سے بہت گہری معنوی رکھتا ہے۔انسان جیسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے یہ دنیا کی ہوس میں اندھا ہو کر حیوان بن جاتا ہے۔

اس کھیل میں پلاٹ سے زیادہ مکالموں کی اہمیت ہے۔نظم ونثر میں کرداروں کی گفتگو اور اس کے ساتھ کرداروں کی مختلف حرکات بہت اہم ہے۔اس ڈرامے میں انسانی المیے کو یوں پیش کیا گیا ہے کہ ماسٹر علم دین ایک نہایت محنتی اور ایماندار شخص ہے۔اس کا تعلق غریب گھرانے سے ہے۔ماسٹر کے گھر میں چوہے بہت ہیں۔وہ ہر وقت ان چوہوں سے جنگ لڑتا رہتا ہے۔ان کو ختم کرنے کے لیے کبھی وہ بلی لے آتا ہے، کبھی چوہے دان، کبھی پولیس کی مدد اور کبھی سائیں جیسے عامل کے ذریعے ان کو ختم کروانے کے منتر اور ٹونے ٹوٹکے کرواتا ہے۔ماسٹر نے گھر میں مختلف اہل علم اور دانش مندوں کی تصاویر رکھی ہیں۔وہ اکثر ان کو نکال کر ان سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ایک دن وہ نظم لکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔یہ نظم اس نے آغا شمس الدین کے فلسفہ اخلاق سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ماسٹر آغا شمس الدین کی علم دوستی، فیاضی، سخاوت، سیاست اور شخصیت سے بہت متاثر ہے لیکن ایک دن جب آغا شمس الدین اپنے بیٹے کو امتحان میں پاس کروانے کی درخواست کرتا ہے تو علم و دانش اور فلسفے کا نقاب کے پیچھے اس کا اصلی چہرہ نظر آتا ہے جو بدصورت اور بھیانک ہے۔ماسٹر انکار کر دیتا ہے۔ماسٹر کی بیوی اسے سمجھاتی ہے کہ ایسے بڑے لوگوں کی نافرمانی کر کے سے تعلقات خراب نہیں کرنے چاہیں۔ماسٹر ایک طرف اپنے خیالات ونظریات کی جنگ لڑ رہا ہے دوسرے طرف وہ غربت کے سامنے بھی سینہ سپر ہے۔یہ جنگ جیتنے کے لیے وہ کچھ دن رشوت لینا شروع کر دیتا ہے۔بڑے بڑے سیاسی لوگوں سے ملنا جلنا شروع کر دیتا ہے۔اس کی بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے۔وہ کالج میں اپنے کلاس فیلوز کو اپنی جھوٹی امارت کے قصے سناتی ہے۔ماسٹر کے قادر خان جیسے کاروباری لوگوں اور سیاسی و سماجی اثر رسوخ رکھنے والے آغا شمس جیسے امیر لوگوں کے ساتھ تعلقات بن جاتے ہیں۔نیا گھر، جدید طرز زندگی، کھانا پینا پہننا اوڑھنا انگریزی طرز کا شروع ہو جاتا ہے۔ایک دن قادر خان آغا شمس الدین کو ایک لڑکے کے بابر کے روپ میں لے کر آتا ہے اور ماسٹر کو بتاتا ہے کہ میرا یہ بیٹا دوبئی سے آیا ہے۔میں چاہتا ہوں۔اس کی شادی آپ کی بیٹی سے ہو جائے۔کیونکہ آپ کی بیٹی جیسی مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کوئی نہیں ہے۔ماسٹر رشتہ منظور کر لیتا ہے۔ماسٹر کی بیوی اور بیٹی بھی بہت خوش ہیں کہ ایک امیر گھرانے میں شادی ہو رہی ہے۔لیکن شادی کی پہلی رات بیٹی کو پتا چلتا ہے کہ اس کا دولہا تو خود بوڑھا آغا شمس الدین ہی ہے۔وہ بھاگ کر واپس اپنے ماں باپ کے گھر آ جاتی ہے۔ماسٹر کی زندگی کا سنہری دور ختم ہو جاتا ہے۔وہ قادر خان اور آغا شمس الدین کا دیا ہوا نیا گھر چھوڑ کر اپنے پرانے گھر میں اسی پھٹے پرانے لباس میں آ جاتا ہے۔وہی پرانی سائیکل اور چوہوں کے ساتھ دوبارہ رہنا شروع کر دیتا ہے۔ماسٹر چوہوں کو گالیاں دیتا ہے۔ان کے پیچھے بھاگتا ہے۔کھیل کے سب کردار چوہے بن کر انہی کی طرح نقل وحرکت شروع کر دیتے ہیں۔اس طرح کھیل کا انجام ہوتا ہے۔

اس کھیل کا مرکزی کردار ماسٹر خیر کا نمائندہ ہے۔ یہ ایک مثالی کردار ہے جسے اپنی روایات، اصولوں، اخلاقیات اور علم و ادب سے شدید لگاؤ ہے۔ کسی بھی لالچ، طمع اور حرص سے اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے ہیں۔ وہ چوہوں سے جنگ لڑ رہا ہے۔ چوہوں کا وجود سماج دشمن عناصر کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جن سے معاشرے کے سب افراد ڈرتے ہیں۔ ماسٹر، سکینہ اور زینت بھی ان سے ڈرتے ہیں۔ اس خوف کو ختم کرنے کے لیے ماسٹر طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے۔ کہیں علم سے شکست دینا چاہتا ہے۔ کبھی ڈانس کر کے، گانے گا کر ان کو بھگانا چاہتا ہے۔ کبھی کسی عامل سے ان کو طابع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہیں دولت سے اور کہیں ہتھیاروں سے اکیلا لڑتا ہے کیونکہ معاشرے میں امن عامہ کے ادارے پولیس اور فوج بھی انہیں ختم کرنے میں ناکام ہیں۔ حکومتی سپاہی بندوقیں لیے گشت کر رہے ہیں اپنی ڈیوٹی کے دوران چرس پی رہے۔ چرس کے سگریٹ ان کی غفلت کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں کیونکہ نشے کی حالت میں سپاہی ان چوہوں کو بھگیاڑ سمجھتے ہوئے اپنی وردیاں، بلیٹ، ٹوپیاں اور بندوقیں چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ماسٹر کی زندگی کو دیکھ کر طنز و مزاح کا تیر دل میں پیوست ہو جاتا ہے لیکن خون نہیں نکلتا بلکہ درد کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی حرکتوں سے ہنسی کی لہر اٹھتی ہیں لیکن لب سل جاتے ہیں اور آدمی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ قہقہہ لگائے یا ماتم کرے۔ ماسٹر چوہوں سے لڑنے کے لیے ایک آخری حربہ استعمال کرتا ہے۔ وہ کرپشن شروع کر دیتا ہے۔ اس کی روزمرہ زندگی کے سب معمولات بدل جاتے ہیں۔ گھر نام اور پتے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وہ انسان سے حیوان بن جاتا ہے لیکن ماسٹر اپنے اندر کے انسان کو مرنے نہیں دیتا۔ وہ دوبارہ اپنی جون تبدیل کر کے انسان بن جاتا ہے۔ پھر اس کی وہی زندگی ہے جس میں چوہوں سے لڑ رہا ہے، چوہے اس پر ہنس رہے ہیں، ماسٹر قرضے لے رہا ہے، پاگل بنا ہوا ہے، بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، بیوی کے طعنے سن رہا ہے، اس کے پاس وہی پرانی سائیکل ہے جو دس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔

زینت اچھی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ہائی سوسائٹی میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہے جہاں دھوکا، فراڈ اور کمینگی ہے۔ جہاں سب چوہے رہتے ہیں۔ شادی کی پہلی ہی رات زینت دیکھ لیتی ہے۔ اس کا دولت مند خوبصورت دولہا ایک دم انسان سے بدصورت چوہے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو اس کے کپڑے اور اس کے بدن کو کترنا شروع کر دیتا ہے۔ زینت بھی اپنے باپ کی طرح اس ہائی سوسائٹی کا حصہ نہیں بنتی بلکہ وہاں سے بھاگ کر واپس اپنے باپ کے گھر آ جاتی ہے۔ ذرا زینت کے کچھ مکالمے ملاحظہ کیجیے:

بیوی: زینو بابر کہاں ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟

زینو: (ڈرامائی انداز میں) بابر۔ ہوں۔ بابر کون اماں؟

بیوی: (ہنستی ہے) لو پوچھ رہی بابر کون۔۔۔۔ چل بتا تجھے کیسا لگا ہے۔

زینو: بابر۔ اماں جب میں بابر کے ساتھ قادرن خان کے گھر پہنچے تھے تو چاروں طرف پھول تھے۔

بیوی: پھول

زینو: اور میرے کمرے میں روشنیاں، خوشبوئیں اور رنگ بکھرے تھے۔

ماسٹر: واہ روشنیاں۔

بیوی: اچھا۔۔۔رنگ۔

زینو: اور پھر رات ہوگئی۔آہستہ آہستہ ساری روشنیاں ایک ایک کرکے بجھ گئیں۔اور پھر
میں نے دیکھا میرے ساتھ بابر بیٹھا ہے۔آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں
مڑنا شروع ہوگئیں۔اس کے بازو مڑنے لگے اور اس کی مونچھیں نکلنا شروع ہو
گئیں۔اور پھر ہا۔ہا اس کی دم نکل آئی اور اس نے خوبصورت پردوں کو کتر
نا شروع کر دیا، کتر۔کتر۔کتر

بیوی: کیسی باتیں کررہی ہو۔پاگل ہوگئی ہو۔ (۱)

یہ کردار تجریدی، علامتی اور طنزیہ انداز میں بات کرتے ہیں۔طویل اور مختصر مکالموں کا ایک ایک لفظ اپنی کئی کئی معنوی سطحیں لیے ہوئے ہے۔یہ ڈراما نظم ونثر، اُردو، انگریزی اور پنجابی زبان کا خوبصورت مرقع ہے۔زینت نرسری رائم گاتی ہے، ماسٹر اپنی نظم ''شریف آدمی سر جھکاتا نہیں'' پڑھتا ہے۔یہ خود کلامی اور کہیں تقریر کرتا بھی نظر آتا ہے۔جس کے پیچھے اس کی بہت سی نفسیاتی وجوہات ہیں کیونکہ جس معاشرے میں وہ رہتا ہے وہاں سب کچھ اس کی سوچ کے برعکس ہے۔وہ علم اور سچائی پھیلانا چاہتا ہے لیکن ہر طرف جہالت اور جھوٹ پھیلا ہوا ہے۔اس کھیل کا ایک کردار سائیں کے ہاں منٹو کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔منٹو نے اپنے افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں لکھا:

''اوپڑی دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی مُنگ دی دال آف دی لالٹین''۔(۲)

سائیں جب چوہوں کو اپنے منتر سے کیلنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بھی ایسا منٹو کی زبان میں یوں منتر پڑھتا ہے:

'' حق اللہ۔اُوپڑی دی گڑگڑ دی، گڑگڑ لائین دی ٹھاہ۔ گدے چکید ے بھکید ے، گلتے
پھرے ٹھاہ''۔(۳)

ان کرداروں کے ہاں کہیں کہیں لایعنیت کا احساس ہوتا ہے۔ڈرامے میں میتھ، نادر تشبیہات، علامت، استعارے، تضادات، مختلف زبانوں کے ماہرین اور شخصیات کے حوالے، عجیب وغریب تراکیب کا استعمال علم الکلام، علم موسیقی، علم الطب، علم رمل، علم نجوم، علم الہندسہ، معاشیات، سماجیات، تاریخ اور شاعری کی مختلف اصطلاحات کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ان کرداروں کے ہاں مکالماتی سطح پر بھی جگہ جگہ تصادم نظر آتا ہے۔ایک سین میں دو سیٹ بیک وقت استعمال ہوئے۔جس میں ایک طرف زینت اپنی سہیلی کو اپنے خاندان کی امارت کی داستان سنا رہی ہے۔اسی وقت دوسرے سیٹ پر ماسٹر اپنی غربت کے قصے بیان کررہا ہے۔

یہ کھیل اپنے دور میں اور بعد میں اب تک فنی فکری اور موضوعاتی حوالے سے انفرادیت رکھتا ہے۔اس کھیل کے موضوعاتی حوالے سے گلزار آفاقی لکھتے ہیں:

''اشرف المخلوقات کا موضوع ہمارے گرد سانس لیتی زندگی ہے۔دکھ سکھ اور خوشی غمی سے

عبارت روزمرہ معمولات ہیں ۔ جہاں اخلاقی انحطاط اور سماجی قدروں کی شکست و ریخت کی جنگ جاری ہے ۔ جہاں آدمی حقیقت سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے خوابوں کی دنیا میں زندگی گزارتا ہے ۔ جہاں انسانوں کے جنگل تو آباد ہیں مگر پھر بھی ہر انسان تنہا ہے ۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اسے اپنا آپ بھی نہیں ملتا ۔ سرمد صہبائی نے اشرف المخلوقات میں پاکستانی آدم کی اس گمشدگی کی خبر دی ہے'' ۔(۴)

اُردو سٹیج ڈرامے کی تاریخ میں یہ اپنی طرز کی واحد مثال ہے جو جدید تکنیک ،لسانی وسعت ،فکری پختگی اور عصری شعور سے بھرپور کھیل ہے ۔ یہ اپنی فنی ،فکری اور موضوعاتی حوالے سے ایک نئی روایت کا آغاز کرتا ہے ۔ یہ ایسا کھیل جسے دنیا کے بڑے ناموراور جدید ڈراموں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے ۔ جدید اسٹیج ڈرامے کا ایک بھرپور اور نہایت پختہ کھیل ہے جو ہمیشہ اُردو سٹیج ڈرامے کی تاریخ میں ایک نئی ڈرامائی روایت کے طور پر موجود رہے گا ۔

سرمد صہبائی کا دوسرا کھیل ''حبیش (۲۰ نومبر ۱۹۷۳ء)(۵) کا ٹائپ شدہ مسودہ ہے میرے پیش نظر ہے جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس مسودہ پر ۱۹۷۱ء تاریخ تحریر ہے کہ اس سال پہلی بار پیش کیا گیا ۔ لیکن الحمرا لاہور آرٹس کونسل کی دفتری رپورٹ میں لکھا ہے :

"Sarmad Sehbai's Hash, a serious play, was staged at Arts Council from November 20 to December 9. It was directed by Farooq Zamir Ghory, Cast included Saleem Naser, Tahira Naqvi, Samina Ahmad, Zafer Jaffrey, Zilleh Subhan and Talat Hussain".(6)

دو ایکٹ پر مشتمل یہ ایک فارس ہے ۔ ڈرامہ نگار نے دونوں ایکٹ کو مختلف ''سین'' میں تقسیم کیا ہے ۔ یہ کھیل معاشرے کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتا ہے ۔ اس میں مختلف علامتی زاویوں سے پاکستان کی تاریخ میں پیش آنے والے سیاسی اور سماجی حادثات کہ کس طرح نسل در نسل فکر و عمل کے بحران کا باعث بنے اور حبیش کی طرح سوچ کی صلاحیت کو ماؤف کرتے رہے ۔ اس میں اسی قومی المیے کی تصویر کشی کی ہے ۔ اس لیے اس کھیل کا عنوان بھی ''حبیش'' رکھا ہے ۔ اس میں وقت ایک تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ کسی نہ کسی حوالے سے تمام کردار شدید داخلی تصادم کا شکار ہیں ۔ اس کھیل میں پلاٹ نہیں ہے کرداروں کی باتیں اور ان کی نقل و حرکت اہم ہے ۔ اس کے ساتھ سرمد صہبائی نے اپنی مختلف نظموں کو کھیل کا حصہ بناتے ہوئے چھوٹے چھوٹے سین میں تقسیم کیا ہے ۔

اس کھیل کی کہانی یوں ہے کہ ربو کے فلیٹ پر اس کا دوست علی دیواروں پر مختلف پوسٹر لگا رہا ہے ۔ اس دوران ان کا ایک اور دوست جمی بھی آ جاتا ہے ۔ وہ پوسٹر دیکھ کر نعرے کے انداز میں کہتا ہے ۔'' Here comes the revoltion through the barrel of a borrowed gun.'' جمی اپنے دوست

علی کو مشورہ دیتا ہے کہ ان پوسٹرز کو اقوام متحدہ کے سکریٹری کے پاس بھیج دو۔علی کہتا ہے وہ اسے ناکٹ پیپرز کے طور پر استعمال کرے گا۔جمی ہارسکوپ نکالتا ہے اور اس سے تاریخ پیدائش پوچھتا ہے تا کہ اسے بتائے کہ یہ ہفتہ کیسا گزرے گا۔علی کہتا ہے کہ میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں تو صرف ایک ڈمی ہوں۔لہٰذا تم اپنا ہارسکوپ پڑھو کیونکہ تم پیدا ہوئے ہو۔تمہارے سر پر لوہے کی ٹوپی اور منہ میں چاندی کا چمچ تھا۔جمی مختلف لڑکیوں کے بارے اپنے نظریات بتاتا ہوئے کہتا ہے کہ مجھے برقعہ پوش لڑکیوں سے نفرت ہے کیونکہ یہ بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ان کی آنکھیں نقاب میں مردوں کو گھورتی رہتی ہیں۔پھر اپنی دوست سعیدہ کے بارے بتاتا ہے کہ اسے جن چمٹا ہوا ہے۔ علی کہتا ہے تم تو مجھے صرف ہمٹی ڈمٹی لگتے ہو اور جب تمہیں اپنے ٹوٹنے کا احساس ہوتا ہے تو تمہاری ممی بڑی ہوشیاری سے تمہارے ٹکڑوں کو واک مین، ہنڈا کار، نئی سلک شرٹ یا ویڈیو فلم سے بھر دیتی ہے۔جمی کہتا ہے میری ماں میرے ڈیڈی کے ساتھ بھی ایسے ہی کرتی ہے۔علی کہتا ہے ہر ماں ہر ڈیڈی کے ساتھ ایسے کرتی ہے لیکن ان کا خول اتارا جائے تو اندر سے خالی صفرہ نکلتا ہے۔پھر جمی کھڑکی سے نیچے جھانکتا ہے۔علی اس کو منع کرتا ہے کہ ربو نے تمہیں یہاں کھڑے دیکھ لیا تو تمہاری ہڈیاں توڑ ڈالے گا۔جمی اس کی باتیں سنے بغیر کھڑکی کے باہر کا منظر بیان کرنا شروع کر دیتا ہے کہ لینڈ لاٹ کی لڑکی کتے سے کھیل رہی ہے۔کتا اس کے پاؤں چھاٹ رہا ہے۔اس دوران اچانک ربو داخل ہوتا ہے اور جمی کو کھڑکی سے پرے ہٹاتا ہے۔جمی اور ربو کچھ دیر آپس میں جھگڑتے ہیں پھر جمی فرش پر گر جاتا ہے۔ربو کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے ہمسائے فیض اللہ کے بارے باتیں کرتا ہے۔علی بھی ربو کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ربو، علی کو منع کرتا ہے کہ ہمسائیوں کے گھر میں جھانکنا بری بات ہے۔ پھر ربو نظم شروع کر دیتا ہے جس میں کہتا ہے کہ تم کو اپنے جسم کا محصول دینا ہوگا۔کہو کہ تم اپنے مالک کا بغیر وضو کے نام نہیں لو گے۔کہو کہ پلاسٹک کے پھولوں اور میری بیوی کو نہیں دیکھو گے۔اس دوران جمی کو ہوش آتا ہے اور وہ کہتا ہے یہ سب بکواس بند کرو اور یہ سوراخ بھی بند کرو،لیکن ربو کہتا ہے یہ سوراخ بند ہو گیا تو میری سانس بند ہو جائے گی میرے سارے خواب اڑ جائیں گے۔یہ تو جنت کا دروازہ ہے۔یہاں مسٹر فیض اللہ اپنی پاکیزہ بیوی اور بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر فلاش کھیلتے ہیں۔پھر تینوں دوست موم بتی کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور حیش پینے لگتے ہیں۔پھر شہلا داخل ہوتی ہے۔وہ اپنی شال اتار کر ایک طرف رکھی دیتی ہے اور اپنے جسم کے مختلف حصوں سے مختلف چیزیں نکال کر میز پر رکھتی ہے۔ان چیزوں میں ٹوتھ پیسٹ اور کتابیں وغیرہ ہیں۔یکدم ایک شیشی کے گرنے کی آواز آتی ہے۔تینوں لڑکے شہلا کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں اور پھر آ کر اس کی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔جمی پوچھتا ہے یہ چیزیں کہاں سے چوری کی ہیں۔وہ بتاتی ہے کہ میں مختلف دوکانوں سے یوں چرا کر لائی ہوں۔

پھر سب لوگ موم بتی کے گرد بیٹھے چرس پی رہے ہیں۔ربو کھڑکی سے باہر لان میں جھانکتے ہوئے بتاتا رہا ہے کہ مسٹر فیض اللہ کیاری سے سرخ گلاب توڑ کر اپنی بیوی کو دے رہا ہے۔اب وہ دوسری کیاری میں چلے گئے ہیں۔اب فیض اللہ کا بوس (boss) برکت علی بڑی بڑی مونچھوں والا آیا ہے اور یہ دونوں کتے کی طرح اس کے تلوے چھاٹ رہے ہیں۔اب ان دونوں کی دمیں نکل آئی ہیں۔یہ دمیں ہلا رہے ہیں۔برکت علی ہنس رہا ہے اس کا

سونے کا دانت چمک رہا ہے۔ادھر علی اٹھ کر ربو کو کھڑکی سے ہٹاتا ہے۔ربو اس سے جھگڑتا ہے کہ تم نے میرے خوابوں کو قتل کر دیا ہے۔پھر شہلا ربو کو پچکارتے ہوئے چرس کا سگریٹ دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ آج کل یونیورسٹی میں چیچک کی طرح سیمینار پھیلے ہوئے ہیں۔شہد کی مکھیاں کے ماہر ایک امریکی نے کہا ہے کہ پاکستان میں شہد کی مکھیوں کو سائینٹفک انداز میں پالا جائے تو یہ ملک خود کفیل ہو سکتا ہے۔ہمارے پروفیسروں نے جلادوں کی طرح گاؤن پہنے ہوئے تھے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان بھی چین بن سکتا ہے۔پاکستان بھی کوریا بن سکتا ہے۔پھر تینوں مل کر پاکستان پر تنقید کرتے ہیں کہ کاش پاکستان پاکستان بن جاتا۔پھر ربو اپنی دوست سعیدہ کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ یہاں ہمارا تماشا دیکھنے آتی ہے۔وہ حیش نہیں پیتی بلکہ حیش پینے کا مائم کرتی ہے۔اچانک سعیدہ آ جاتی ہے اور موم بتی کے گرد بیٹھ کر حیش پینے لگتی ہے۔

ادھر علی نشے کی حالت میں مدہوش ہے اچانک گھبرا کر اٹھتا ہے اور خواب کی حالت میں میز کی طرف دیکھتا ہے وہاں ایک آدمی سیاہ لباس پہنے ہاتھوں پر دستانے چڑھے کچھ کاغذات دیکھ رہا ہے۔سیاہ پوش آدمی اسے کہتا ہے کہ تم کو تنظیم نے جو ذمہ داریاں دی تھیں۔وہ تم نے پوری نہیں کی ہیں۔اس کے علاوہ غیر انقلابی رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔تم نے اپنے طبقاتی کردار کی وجہ سے انقلاب سے غداری کی ہے۔لہٰذا تنظیم یہ برداشت نہیں کر سکتی۔تنظیم کا ڈسپلن خراب ہو رہا ہے۔تم محنت کش عوام میں کام کرنے کی بجائے سستے ہوٹلوں میں بحث مباحثہ کرتے ہو۔اس کے علاوہ شہلا کے ساتھ بھی تمہارے تعلقات ہیں حالانکہ وہ پورژوا لبرل ہے۔اب تمہیں چاہیے کہ تم اپنے اس غیر انقلابی دشمن کے لیے تنقید کرو۔علی کہتا ہے کہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا، نہ ہی کوئی جرم کیا ہے۔جس کے لیے میں تنظیم سے معافی مانگو۔سیاہ پوش کہتا ہے کہ تم کلاس کمپلکس کا شکار ہو۔علی کہتا ہے میں انقلاب دشمن نہیں ہوں۔ پس منظر میں باسٹرڈ کی آوازیں بلند ہوتیں ہیں۔

شہلا رقص کے انداز میں گھومتی ہوئی کرسی پر جا بیٹھتی ہے۔اچانک سیاہ پوش پھر کمرے میں داخل ہوتا ہے اور شہلا کے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔پھر دونوں اٹھ کر رقص کرنے لگتے ہیں۔پھر جمائیاں لیتی ہوئی سو جاتی ہے۔اس دوران چومنے چاٹنے کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔اب جمی کی گھبرا کر آنکھ کھلتی ہے۔ایک عورت کے ہنسنے کی آواز بلند ہوتی ہے۔پھر مرد کے کھانسنے کی آواز آتی ہے۔اچانک مختلف لوگوں کی سرگوشوں کا شور کا بلند ہوتا ہے۔پھر دبی آواز میں قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔جمی کے چہرے کے تاثرات خوفناک حد تک بدل جاتے ہیں۔پھر سیاہ پوش داخل ہوتا ہے اور شہلا کو ایک بڑا سا واک مین پکڑا کر چلا جاتا ہے۔

جمی علی، ربو اور شہلا اپنی اپنی جگہوں پر گھٹنوں کے بل بیٹھے ہیں۔ان کی گردنیں لٹکی ہوئی ہیں۔ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔یہ کورس کے انداز میں بولتے ہیں۔ہم گم شدہ نسلیں ہیں،تاریکی نے ہمیں نگل لیا ہے،شہر ایک سازش ہے،ہم روز قتل ہوتے ہیں،نیون سائن میں خطرے کے نشان ہیں،میرا شناختی کارڈ کہاں ہے،ہم لوہے اور بارود کی گندم کھاتے ہیں،ہم کون ہیں،ہمارے چاروں طرف شکاری کتے ہیں وغیرہ وغیرہ پھر سیٹیوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور آخر میں سب حیش حیش پکارتے ہیں۔اچانک سعیدہ رقص کرتی ہوئی داخل ہوتی ہے پھر

ربو کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر مسٹر فیض اللہ کے گھر میں جھانکتا ہے اور علی کو بتاتا ہے ۔ابھی دھوپ نہیں نکلی اس لیے یہ لوگ باہر نہیں آئے اور آج ان کا کتا بھی نظر نہیں آ رہا۔ میں ان کے لیے چھ گولیوں والی پستول خریدی ہے۔ان کو میرے ارادے کی خبر ہو گئی ہے۔اس لیے یہ باہر نہیں نکل رہے ۔جمی بتاتا ہے کہ میری ممی مجھے سی ایس پی آفیسر بھرتی کروا رہی ہے۔علی کہتا ہے میرا ڈیڈی بھی آرمی میں بھرتی کرانے کے لیے کوشش کر رہا ہے۔

ربو ایک دم پستول نکال کر ناظرین میں ایک عورت سے مخاطب ہوتا ہے کہ تمہاری لڑکیوں کے لیے میری چمڑی کے ربن بنتے ہیں۔تم ہر روز میرے خون سے اپنی لپ سٹک کا شیڈ لگاتی ہو۔پھر ایک مرد سے کہتا ہے تم دو گولیوں سے مرو گے، ایک دوسرے سے مرد سے کہتا ہے تم اندھیرے میں چھپ رہے ہو لیکن تمہارا سونے کا دانت چمک رہا ہے۔ میں اس کا نشانہ لوں گا۔علی، ربو سے کہتا ہے تم دیواروں سے باتیں کر رہے ہو یہاں کوئی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ سے پستول پکڑ لیتا ہے ۔ربو کانپتے ہاتھوں سے چرس والے سگریٹ کا لمبا کش لگاتا ہے ۔پھر علی اخبار پکڑ کر جمی اور شہلا کو بتا رہا ہے کہ امریکہ نے پاکستان سے دو سو برقعے منگوائے ہیں تا کہ تیزابی کا لباس تبدیل کرنے کے لیے ساحلی خیمے بنائے جا سکیں ۔اس دوران سعیدہ داخل ہوتی ہے ۔برقعہ اتار کر ربو کے پاس بیٹھ جاتی ہے اور اس کے ہاتھ سے سگریٹ پکڑ لیتی ہے ۔اور سگریٹ کے لمبے کش لگاتی ہے ۔میوزک شروع ہوتا ہے اور سعیدہ نشے کی حالت میں اٹھ کر اپنے برقعے کو پکڑتی ہے اور ربو اس مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم کو جن چمٹا ہوا ہے ،تم مر گئی ہو،تمہیں چمگادڑ چمٹی ہوئی ہے۔ پھر نہایت وحشیانہ انداز میں برقعے کو پھاڑنے لگتی ہے ۔یہ چمگادڑ میرا خون چوس رہی ہے، مارو اسے، ربو اس کی طرف پستول لیے جاتا ہے ۔فائر کی آواز آتی ہے اور سعیدہ گرتی ہے ربو اس کو تھام لیتا ہے۔اس طرح کھیل ختم ہوتا ہے۔

اس کھیل کا مرکزی کردار ربو غریب فیملی سے تعلق رکھتا ہے ۔ربو شہری زندگی میں پھیلے ہوئے المیے کی داستان کا ایک کردار ہے ۔یہ شہر میں پھیلے سرمایہ داروں ،سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں بیٹھے ان افسران کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے ۔جنہوں نے بنکوں ، گاڑیوں ، اداروں اور انسانوں پر قبضہ کیا ہوا ہے ۔اس کے نزدیک یہ لوگوں چمگادڑ ہیں جو خون چوس رہے ہیں ۔اس طرح ربو کو ایسے لوگوں سے شدید نفرت ہے جو اپنے افسروں کو خوش رکھنے کے لیے کتے کی طرح ان کے تلوے چھاٹتے ہوئے دم ہلاتے ہیں اور اپنی بیوی کو ان کے سامنے پیش کرتے ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر سکیں ۔جیسا کہ اس کھیل میں فیض اللہ ہے ۔جس سے ربو کو شدید نفرت ہے ۔

سعیدہ کا تعلق اپر مڈل کلاس سے ہے ۔اس نے اپنی شخصیت کو نقاب میں ڈھانپا ہوا ہے تا کہ اس کی آزادی محفوظ رہے ۔اسے ایک طرف ربو سے محبت ہے دوسری طرف کے خاندان مسائل ہے ۔وہ یہاں صرف ربو سے ملنے آتی ہے ۔لیکن ربو اسے پسند نہیں کرتا ہے کیونکہ اسے امیروں سے نفرت ہے ۔سعیدہ بھی تنگ آ کر حیش پینے لگ جاتی ہے ۔

علی اور جمی کا تعلق اپر کلاس سے ہے لیکن ان کے اندر بغاوت ہے ۔وہ اپنے والدین کے راستوں پر چل کر آسائش کی زندگی نہیں گزارنا چاہتے ۔ان کے والدین ان کو سی ایس پی آفیسر بنانا چاہتے ہیں لیکن یہ سفارش سے

ملازمت حاصل نہیں کرنا چاہتے ۔جمی کی نسبت علی کا کردار بڑا مضبوط اور جاندار ہے ۔علی زندگی کا وسیع مشاہدہ اور تجربہ رکھتا ہے ۔علی اپنے دوست جمی پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''جب کبھی تمہیں اپنے ٹوٹنے کا احساس ہونے لگتا ہے تو تمہاری ممی بڑی ہوشیاری سے بڑی عقلمندی سے تمہارے ان ٹکڑوں کو کسی واک مین سے ،نئی سلک شرٹ سے، ۹۰ سی سی ہونڈا سے، اور کبھی ویڈیو فلم سے بھر دیتی ہے''۔(۷)

اس طرح شہلا کا تعلق متوسط طبقے سے ہے ۔اس نے اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے چھوٹی موٹی چوری چکاری کا رستہ اپنایا ہے ۔شہلا دکانوں سے مختلف اشیا چوری کر کے یہاں ربو کے فلیٹ پر آ جاتی ہے اور دوست کے ساتھ بانٹ کھاتی ہے ۔شہلا اپنے دوست علی سے کہتی ہے :

''جس آسانی سے میں سانس لیتی ہوں، اسی آسانی سے میں چوری کرتی ہوں اور ان سب چیزوں کے لیے مجھے کسی کا احسان نہیں لینا پڑتا، کسی کو تھینک یو سر نہیں کہنا پڑتا اٹس گڈ فن''۔(۸)

یہ کھیل مجموعی طور پر اردو میں لکھا گیا ہے لیکن انگریزی الفاظ بھی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں ۔اس کھیل استعارات اور علامتیں بھی استعمال ہوئی ہیں ۔مثلاً ''جن'' کی علامت سرمد صہبائی کے ہاں اکثر ڈراموں میں استعمال ہوئی ہے ۔اس کھیل میں بھی یہ علامت موجود ہے جو حاکم کے لیے استعمال ہوئی ہے جس کا ملک کی تمام اشیا اور لوگوں پر قبضہ ہے ۔دوسری علامت ''چمگادڑ'' کی ہے یہ بھی حکومت کے صاحب اقتدار لوگوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو غریب لوگوں کا خون چوستے رہتے ہیں ۔اس طرح ''لوہے کی گندم''، ''سونے کے دانت'' اور ''کتا'' کے استعارہ بھی استعمال ہوئے ہیں ۔یعنی اس ملک کے عوام کو کھانے کے لیے لوہے کی گندم ملتی ہے ۔صاحب اقتدار لوگ چمگادڑ کی طرح خون چوس رہے ہیں اور ان کے دانتوں میں سونا لگا ہوا ۔جو لوگ ان کی چاپلوسی کرتے ہیں ۔وہ کتے کی طرح ان کے تلوے چاٹتے ہوئے اپنی بیویوں کو استعمال کر کے مراعات حاصل کرتے ہیں ۔

اس کھیل میں سادہ سا سیٹ ہے پہلے منظر میں ایک نیچی چھت والا گیراج ہے جس کو کمرے میں تبدیل کر دیا ہے ۔اس طرح دیواروں پر مختلف پوسٹر لگا کر کیفے کے سیٹ میں اس کو تبدیل کیا ہے ۔ایک میز، چند کرسیاں ایک کتابوں کی الماری رکھ کر فلیٹ کا منظر بنایا ہے ۔سامنے دیوار سے ایک سوراخ نما کھڑکی ہے جس سے ساتھ والے گھر کا لان نظر آتا ہے ۔اسی ایک ہی سیٹ میں تمام کردار حرکت کرتے ہیں ۔لائٹ کے لیے جنرل لائٹ اور موم بتیاں استعمال ہوئی ہیں ۔

اُردو اسٹیج ڈرامے کی روایت میں یہ کھیل جدید اردو سٹیج کی نمائندگی کرتا ہے ۔یہ کھیل نظم و نثر، علامت، استعارے، مائم، روشنی، صوتی تاثرات اور موضوعاتی جدت سے بھرپور ہے ۔فنی اور فکری اور موضوعاتی حوالے سے یہ ایک اہم سکرپٹ ہے ۔جدید اُردو ڈرامے کے فروغ میں سرمد صہبائی کا یہ کھیل ایک نیا موڑ ہے جن سے فنی و فکری اور موضوعاتی حوالے سے اُردو سٹیج ڈرامے کی بہت سی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں ۔

سرمد صہبائی نے ''اشرف المخلوقات'' اور ''حبیش'' میں جہاں جدید فنی اور فکری تکنیکوں کو استعمال کیا ہے وہاں اپنی کلاسیک داستانوں کے کرداروں ،میتھ اور علامتوں کو بھی استعمال کیا ہے لیکن ان کو نئے معنی اور نئی صورت حال میں رکھ کر پیش کیا ہے ۔لسانیاتی حوالے سے بھی جدتوں سے لبریز اُردو، انگریزی اور پنجابی کے علاوہ مختلف علاقائی زبانوں کے امتزاج سے ایک خوبصورت اسلوب بنایا ہے ۔انھوں نے سندھی ہسرائیکی، پنجابی اور پہاڑی زبان کے الفاظ بھی خوبصورتی سے استعمال کیے ہیں ۔

سرمد صہبائی کے ان اسٹیج ڈراموں میں پاکستانی معاشرے اور اس کی مٹی میں گندھا ہوا تخلیقی کرب محسوس ہوتا ہے ۔ان کو بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے ۔اس لیے وہ پروپیگنڈہ کی سطح پر نہیں آتے ۔وہ کسی پر اس طرح کی تنقید نہیں کرتے کہ پابندی لگ جائے ۔انھوں نے ہمیشہ ایک دوسرا راستہ اختیار کیا بات کہنے کا جو بلاواسطہ تھا جو بین السطور تھا، جو ہمیشہ استعارے کی شکل میں سامنے آیا ہے ۔انھوں نے اپنے ان ڈراموں میں کوئی فرضی کردار پیش نہیں کیا۔ان کے ڈارموں میں انسانی المیوں ، معاشرتی ٹوٹ پھوٹ سماجی بندھنوں اور جھوٹے رشتوں، سیاسی قوتوں کا ظلم وستم ، اقتدار کی نا انصافیاں ، خیر وشر، جبر واختیار اور معاشرتی تضادات کے مسائل پیش ہوئے ہیں ۔ان کے کردار دکھوں میں گرفتار ہیں ۔انھوں نے اپنے دور کے نمائندہ کرداروں کو پیش کیا ہے جو اپنے اپنے خول میں جہاں ہیں وہیں گھومتے ہیں ۔ان کے کردار اس عہد کے بے بس لوگ ہیں ۔اس لیے وہ کچھ کر نہیں سکتے لیکن بولتے رہتے ہیں اور اظہار کے لیے گفتگو کو وسیلہ بناتے ہیں ۔ یہ کردار زندہ ہیں ۔ان کی رگوں میں انسانی خون دوڑتا ہے اور وہ اپنے عیبوں پر پردے نہیں ڈالتے بلکہ ننگے ہو جاتے ہیں اور اپنے عہد کی تمام خرابیوں کو برہنہ کر دیتے ہیں ۔اس طرح معاشرتی جبر کے آگے مغلوب نہیں ہوتے ، استحصالی ذائقوں کو موسموں کی اٹل حقیقت نہیں سمجھتے بلکہ جدوجہد کے راستوں سے نجات کی خوشبوؤں تک پہنچنے کا اقرار کرتے نظر آتے ہیں ۔ان کا ہر ڈرامہ ایک مخصوص انداز میں سطر بہ سطر پھیلتا جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سمٹتے ہوئے خیال کی آخری انتہاؤں پر اپنے آپ کو ''ڈی فائن'' کر دیتا ہے ۔انھوں نے اپنے کھیلوں میں جدید عہد کے کھوکھلے ، بے ضمیر اور بے چہرہ لوگوں کی کہانی بیان کی ہے جو بنا کسی آدرش کے زندگی گزار رہے ہیں یہ کہانی ہمارے ہاں افسانوں میں کسی حد تک نظر آتی ہے لیکن ڈرامے میں یہ کہیں دکھائی نہیں دیتی ۔سرمد صہبائی نے اپنے ڈراموں میں ایسے کرداروں کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے ۔

ہمارے ہاں ڈرامے میں سٹیج کی جدید سہولیات سے استفادہ بہت کم کیا گیا ہے ۔ مالی مسائل کے علاوہ بھی ہمارے ڈرامہ نگاروں نے اس کی طرف توجہ کم دی ہے لیکن سرمد صہبائی نے اپنے ان ڈراموں میں تمام جدید تکنیکی سہولیات اور لوازمات مثلاً ،موسیقی ،مختلف صوتی تاثرات، ڈانس، روشنی اور مختلف رنگوں کا استعمال، نقاب (ماسک)، خواب ، خود کلامی، مائم اور شاعری کو سٹیج پر استعمال کیا ہے ۔سرمد صہبائی نے جدید یورپی ڈرامے کا گہرا مطالعہ کیا ہوا تھا اور ان کو پتا تھا کہ ڈرامے میں کس طریقے سے بات کی جاتی ہے ۔خود کلامی کی تکنیک کیا ہے اور میوزک کو کس طرح پلے کرنا ہے جو یورپ کے ڈرامے کا خاصہ ہے ۔سٹیج کتنی سطحوں پر ہے اور سیٹ کو کتنی دفعہ بدلا جا سکتا ہے ۔بیک وقت سٹیج پر کتنی چیزیں استعمال کی جا سکتی ہیں ۔جیسا کہ اس باب میں ہم نے ''اشرف المخلوقات'' میں دیکھتے

ہیں کہ ایک طرف ماسٹر شرف الدین تصویروں سے استعاراتی گفتگو کر رہا ہے۔ دوسری طرف اس کی بچی نرسری رائم گا کر رہی ہے پس منظر میں چوہوں کی ہنسی کی آوازیں اور لائٹس کا استعمال کیا گیا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامہ نگار کو سٹیج کے دیگر لوازمات پر کس قدر عبور حاصل ہے کیونکہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لائٹ ،کاسٹیوم اور میوزک کو کیسے استعمال کرنا ہے۔ڈرامہ نگار کے علاوہ ایک سلجھے ہوئے ہدایات کار کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں ۔یہ اپنے عہد کے سب ڈرامہ نگاروں سے مختلف ہیں۔انتظار حسین سیدھا لکھنے والے ہیں ۔بانو قدسیہ بھی سیدھا لکھنے والی ہیں جو بات انھوں نے کہنی ہے۔وہ تحریر میں کہتی ہے۔ان کا سارا روز content پر تھا۔سرمد صہبائی تجربے کے آدمی ہیں اوران کے تجربوں کی ویسٹ والی روایت تھی۔وہ ویسٹ کے ساتھ جڑا ہوئے تھے اوراس وقت جونئی نئی تکنیک آ رہی تھیں۔جس میں نقاب پہن لینا، کیموفلاج کرنا، کولاج بنانا،مون تاج بنانا اورتقریر کرنا وغیرہ یہ ساری تکنیک جدید ڈرامے کی تھیں ۔ سرمد صہبائی سینسی بیلٹی کری ایٹ کر رہے تھے ۔ اگر آپ sensibility کریٹ نہیں کر سکتے تو آپ ''حیش'' نہیں لکھ سکتے۔سرمد صہبائی کو''فائٹر'' کہنا چاہیے کیونکہ یہ خالی لکھنے والے ڈرامہ نگار نہیں ہیں، یہ تحریک والے ڈرامہ نگار ہیں اوراس لیے یہ بہت مختلف لکھنے والے ہیں۔ان کے ہاں زیادہ بولڈنس پائی جاتی ہے اور یہ مشکل کام تھا،دوسرا ان کا بات کرنے کا انداز سیدھا نہیں ہے۔سرمد صہبائی جدید ڈراما نگار ہیں ۔بیسویں صدی میں جنگ عظیم کے بعد جوڈویلپمنٹ ہو رہی تھی اور مختلف تحریکیں چل رہی تھیں۔یورپ میں تھرڈ ولڈ میں،ان کی تحریریں اوران کا اسلوب ان سے متاثر ہوا اور جو ڈرامے سرمد صہبائی نے سٹیج پر کیے وہ جدید تھیٹر ڈرامے کا ایک اہم موڑ تھا۔سرمد صہبائی نے اپنے ڈراموں میں بلیک فارس کو استعمال کیا ہے۔ان کا ایک استہزائیہ لہجہ ہے۔جس میں وہ بات کرتے ہیں۔ان کے اسٹیج ڈراموں لکھنے کا انداز بالکل جدید ہے جواُس وقت کے عام ڈراموں سے بہت ہٹ کر ہے۔ان کے یہ دونوں ڈراموں''اشرف المخلوقات اور''حیش'' میں جدید فن ڈرامہ نگاری کی جملہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔

حواشی وحوالہ جات:

(۱) سرمد صہبائی، **اشرف المخلوقات**، قلمی مسودہ،مخزونہ، الحمرا لاہور آرٹس کونسل، ۲۵ جون ۱۹۷۶ء:۷۱

(۲) سعادت حسن منٹو، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' مشمولہ: **منٹو نامہ**، لاہور سنگ میل، ۱۹۹۰ء،ص: ۱۵

(۳) سرمد صہبائی، **اشرف المخلوقات**، قلمی مسودہ،مخزونہ، الحمرا لاہور آرٹس کونسل، ۲۵ جون ۱۹۷۶ء،ص:۵۹

(۴) گلزار آفاقی، روزنامہ **نوائے وقت**، راولپنڈی، ۱۶۔اپریل ۱۹۸۰ء

(۵) سرمد صہبائی کا یہ کھیل غیر مطبوعہ ہے۔پہلی بار یکم جون ۱۹۷۱ء میں نجم الدین ڈرامہ فیسٹول میں پیش ہوا۔دوسری مرتبہ ۲۰ نومبر ۱۹۷۳ء میں پاکستان آرٹس کونسل لاہور میں پیش کیا گیا۔اس کھیل کی ہدایات سرمد صہبائی نے دیں۔الحمرا لاہور آرٹس کونسل میں اس کھیل کا مرکزی کردار طلعت حسین نے ادا کیا تھا۔تیسری مرتبہ یہ کھیل ۲۲۔اکتوبر ۱۹۸۷ میں اقبال

ہال اسلام آباد G7 / 3 میں پیش کیا گیا۔(بحوالہ، محمد نوید، **سرمد صہبائی کی ادبی خدمات کا جائزہ**، غیر مطبوعہ مقالہ (برائے ایم فل اُردو) جی سی یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۷

(6) Annual Report 1973-74, ***The Pakistan Arts Council,*** Lahore: pag:85

(۷) سرمد صہبائی، **حیش**، ٹائپ شدہ مسودہ، مخزونہ، مصنف، ۱۹۷۱ء، ص:۵

(۸) سرمد صہبائی، **حیش**، ٹائپ شدہ مسودہ، مخزونہ، مصنف، ۱۹۷۱ء، ص:۱۱